انجمن ترقی اردو ہند
کا
ہفتہ وار اخبار

وجسٹرڈ نمبر
اے ۹۲۲

ٹیلیفون نمبر ۲۹

تار کا پتہ
" انجمن "
علی گڈھ

قیمت سالانہ
تین روپیہ
ایک پرچہ
تیرہ آنہ
تاریخ اشاعت
۲۲ '۱۵ '۸ '۱

ہماری زبان

ایڈیٹر :- آل احمد سرور

جلد ۱۶ | علیگڈھ - ۲۲ جنوری ۱۹۵۷ ع | شمارہ ۴

دفتار

خلیل الرحمن اعظمی

اردو کے محترم اور مستند ادیب اور ترقی پسند تحریک کے بانی و رہنما سید سجاد ظہیر کی کتاب " روشنائی " ابھی ابھی مکتبہ اردو لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ سرنامے کے طور پر حافظ کا یہ شعر دیا ہے

صلاے چو بوئے خوش آشنائی
بداں مردم دیدہ را روشنائی

چار سو صفحے کی یہ تصنیف دراصل " یادوں کی کتاب " ہے جس میں سجاد ظہیر نے ترقی پسند تحریک کے آغاز سے لے کر ۱۹۴۷ تک کے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ اس طرح گویا ترقی پسند تحریک کی تاریخ سے متعلق پہلی بار ایک ایسی چیز سامنے آئی ہے جسے ہر اعتبار سے مستند کہہ سکتے ہیں۔

ترقی پسند مصنفین کا پہلا حلقہ ۱۹۳۵ء میں چند ہندستانی طلبا نے لندن میں قائم کیا تھا۔ وہیں اس کا پہلا مینی فسٹو تیار کیا گیا۔ جس کی تکمیل و ترتیب میں سجاد ظہیر کے علاوہ ملک راج آنند، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر جیوتی گھوش اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر شریک تھے یہ مینی فسٹو سائیکلو اسٹائل کر کے ہندستان میں ڈاکٹر محمد اشرف محمود الظفر اور رشید جہاں وغیرہ کے پاس بھیجا گیا کہ یہ لوگ یہاں کے ادیبوں سے اس پر رائے لیں اور اگر لوگ اس سے متفق ہوں تو اس پر دستخط کرائیں۔ کچھ ہی دنوں بعد سجاد ظہیر انگلستان سے واپس چلے گئے اور الہ آباد میں قیام کیا جہاں ان کی ملاقات احمد علی، فراق گورکھپوری، شیو دان سنگھ چوہان، پنڈت امرناتھ جھا اور ڈاکٹر تارا چند وغیرہ سے ہوئی۔ احتشام حسین اور وقار عظیم اس وقت وہاں ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔ ان سب نے ترقی پسند ادیبوں کی تنظیم میں دلچسپی لینی شروع کی اور آہستہ آہستہ ایک ایسی ادبی تحریک کو فروغ ہوا جس میں ہندستان کی تمام زبانوں کے ادیب شامل تھے۔ اس تحریک کی ہمت افزائی کرنے والوں میں ٹیگور، جواہر لال نہرو، پریم چند، مولوی عبدالحق، آچاریہ نریندر دیو، ڈاکٹر عابد حسین قاضی عبدالغفار، حسرت موہانی اور سروجنی نائیڈو جیسی ہستیاں شامل تھیں۔ ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی۔ اس کے بعد کلکتہ، دہلی، الہ آباد وغیرہ میں اس کی کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ آہستہ آہستہ اس تحریک نے ہندستان گیر حیثیت اختیار کر لی۔

سجاد ظہیر نے ہندستانی ادیبوں کو منظم کرنے کے سلسلے میں کتنی ہی شخصیتوں کو دیکھا اور پرکھا ہے۔ ترقی پسند ادب کی کس کس طور سے مخالفت کی گئی اور ادبی بحثوں کے سلسلے میں کیا کیا ہنگامے اور دلچسپیاں رہیں ان سب کی مرقع کشی ان کے قلم نے بڑے موثر اور خوبصورت انداز میں کی ہے اور اس کتاب کو پڑھتے ہوئے جہاں لکھنے والے کی محبوب شخصیت کے خدوخال ابھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، وہاں ہمارے ملک کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

سجاد ظہیر کی کتاب دراصل وہاں تک جاکر رک جاتی ہے جب تک ترقی پسند ادب کا دریا چڑھاؤ پر ہوتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ تحریک انتشار اور بحران میں مبتلا ہوجاتی ہے اور آہستہ آہستہ

یہ سرچشمہ خشک ہونے لگتا ہے اور کچھ دنوں سے یہ کیفیت ہوگئی ہے کہ اس کے وجود کا تصور کرکے بار بار غالب کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے

ع ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے

اس جمود و تعطل سے متعلق اردو کے ادیبوں میں کئی سال سے بڑی گرما گرم بحثیں رہی ہیں اور چند ہی ماہ پہلے مئو (اعظم گڑھ) اور حیدرآباد کی کانفرنسوں میں ترقی پسند ادیبوں نے سر جوڑ کر اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ان دونوں کانفرنسوں میں جو مباحثے ہوئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب اس جمود و تعطل سے بیزار ضرور ہیں اور ایک بار پھر تازہ دم ہوکر ادب کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں لیکن ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو کس طرح آگے بڑھایا جائے۔ یہ مسئلہ ابھی اچھی طرح ہمارے ذہنوں میں صاف نہیں ہے۔ کیونکہ مئو میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ یہ طے ہوا تھا کہ اس انجمن کی تنظیم از سر نو کی جائے اور احتشام حسین صاحب اس کے کنوینر مقرر کئے گئے۔ لیکن ایک ہی ماہ بعد حیدرآباد میں بحث کا غالب رجحان یہ تھا کہ اب کسی انجمن یا تنظیم کی ضرورت نہیں اور اگر کوئی انجمن بنائی جائے تو وہ ترقی پسندوں کی انجمن کے بجائے ایک وسیع پیمانے پر ہندستانی ادیبوں کی انجمن ہو جس میں ہر نقطۂ خیال کے ادیب ہوں۔ اس کانفرنس کی روداد اخباروں میں چھپی تو لوگوں کو یہی گمان ہوا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے خاتمے کا اعلان کردیا گیا ہے۔ چنانچہ حیات اللہ انصاری نے قومی آواز میں اڈیٹوریل لکھا جس کا عنوان تھا "انجمن ترقی پسند مصنفین الوداع" اور احتشام حسین صاحب نے اسی اخبار میں ایک بیان بھی دیا جس میں حیرت اور تشویش کا اظہار کیا۔ بعد میں سجاد ظہیر نے ایک بیان کے ذریعے یہ بات واضح کی کہ حیدرآباد میں ساری گفتگو غیر سرکاری اور بے ضابطہ تھی اور اس کی حیثیت محض سوچ بچار اور تبادلۂ خیال کی ہے ابھی ہم نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔

سجاد ظہیر کی کتاب "روشنائی" کی اشاعت نے اس سوال کو ایک بار پھر ہمارے سامنے لاکھڑا کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اپنی ساری خوبصورتی کے باوجود یہ کتاب اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک سے متعلق اس وقت ہمیں دو سوالوں سے واسطہ پڑا ہے۔

(۱) اس انجمن کا ادبی نقطۂ نظر کیوں مشتبہ سا ہوگیا ہے؟

(۲) ترقی پسند ادیبوں کی انجمن نے جن ادیبوں کو شہرت کے آسمان پر پہنچایا ان کی ادبی حیثیت کیوں چند ہی سالوں کے بعد گرگئی اور وہ تھک کر بیٹھ گئے اور ان کا وہ سارا کارنامہ جسے ایک زمانے میں سراہا گیا کیوں بے جان نظر آنے لگا۔

معلوم نہیں ہمارے ادیبوں اور نقادوں نے ان سوالوں پر کس طرح غور کیا ہے اور ان کی نظر میں کون کون سے اسباب ہیں۔ میں تو ادب کا ایک معمولی طالب علم اور ترقی پسند ادبی تحریک کا ایک ادنیٰ ہمدرد ہوں۔ اس حیثیت سے میرا اس مسئلے پر کچھ کہنا چھوٹا منھ بڑی بات ہے۔ لیکن خلوص کے ساتھ اگر دو ایک باتیں پیش کردی جائیں تو امید ہے ناگوار خاطر نہ ہوں گی۔

ترقی پسند ادبی تحریک کی شاید سب سے بڑی خامی "ادبی تنقید" کا فقدان ہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے۔ کیونکہ پچھلے بیس پچیس سال میں ہمارے یہاں نقادوں کی حکومت رہی ہے۔ لیکن ان نقادوں کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ لوگ زیادہ تر ترقی پسند ادبی نظریے کی تشریح کرتے رہے ہیں۔ ان تشریحات اور نظریوں کے اعادے کا ایک اثر یہ ضرور ہوا کہ ترقی پسندی ایک فیشن ہوکر رہ گئی اور ہر چھوٹا بڑا ادیب اسے بازار کا چلتا ہوا سکہ سمجھ کر طبع آزمائی کرنے لگا۔ ہماری تنقید کا فرض تھا کہ ادیبوں کو یہ بتایا جاتا کہ صرف "ترقی پسندی" کافی نہیں ہے۔ بنیادی چیز "ادب" ہے جس پر سب سے زیادہ ہمیں توجہ کرنی ہے۔ ایسی صورت میں عملی تنقید کی ضرورت تھی اور ادیبوں کا فرض تھا کہ وہ ادبی تخلیقات کے سلسلے میں صرف مافی الوقت نظریے یا اس کی صحت کا ہی مطالبہ نہ کریں بلکہ تخلیقی عنصر اور فنی معیار کو بھی پرکھنے کی کوشش کریں لیکن ہمارے یہاں اس کا الٹا عمل ہوا۔ جو ادیب اپنے فن کے سلسلے میں محتاط اور ایک خاص معیار کے پابند تھے وہ چونکہ میکانکی طور پر آئے دن کے سیاسی موضوعات پر ہنگامہ خیز نظمیں یا افسانے نہیں لکھ سکتے تھے اس لئے ان کی ترقی پسندی ہی مشتبہ قرار دی گئی۔ سردار جعفری نے شاہراہ میں ایک طویل مضمون لکھا جس میں انھوں نے فیض اور جذبی کی شاعری کو ترقی پسندی کا سہارا لے کر گرانے کی کوشش کی اور ان کے مقابلے میں اپنی اور کیفی اعظمی وغیرہ کی شاعری کو ترقی پسند ادب کا اعلیٰ نمونہ بتایا۔ مستند ترقی پسند نقادوں کے سرمایے کو کھنگالا جائے تو ہمعصر ادیبوں میں سے کرشن چندر اور سردار جعفری پر تعریفی مضامین مل جائیں گے لیکن فراق، فیض، جذبی، اجمل منظری، بیدی، حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، سہیل عظیم آبادی وغیرہ پر مضمون تو درکنار ان کے ادبی مرتبے سے متعلق دو فقرے بھی نہیں ملیں گے۔

نقادوں میں شاید آل احمد سرور ہی ایک ایسے نقاد ہیں جنھوں نے کرشن چندر کے جذباتی افسانوں پر بیدی کے فن کو ترجیح دی اور پمفلٹ بازی سے شاعروں .... کی ہے تو شاعری کے مقابلے میں ہمیشہ فیض، جذبی اور ان شعراء کو سراہا جن کے یہاں ترقی پسند نظریات کے ساتھ ادبی اقدار کا احترام بھی ملتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے ان کی تخلیقات کا معیار

(بقیہ ص ۱۲ پر)

ہماری زبان

۲۲ جنوری ۱۹۵۷ء

ہندستانی اکیڈمی کا نیا دستور

ہندستانی اکیڈمی یو۔پی نے ہندی اور اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ ایک عرصے تک سرتیج بہادر سپرو اس کے صدر اور ڈاکٹر تاراچند اس کے سکریٹری رہے۔ اردو کے مشہور شاعر اصغر گونڈوی بھی اس سے وابستہ رہے۔ اس نے دونوں زبانوں میں بڑی قابل قدر کتابیں چھاپی ہیں اور اس کا رسالہ ہندستانی جو دونوں زبانوں میں چھپتا تھا اپنے معیاری مضامین کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہندستان کی آزادی کے بعد امید تھی کہ اکاڈمی کی افادیت اور بڑھے گی۔ اور ہندی اور اردو میں تحقیق و تنقید کا اور بھی اعلیٰ معیار پیش کیا جائے گا۔ افسوس ہے کہ یہ توقعات پوری نہیں ہو رہی ہیں گزشتہ دس سال میں اکاڈمی نے جو کام کیا ہے وہ بیشتر ہندی کا ہے۔ اردو پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ بیچ میں اردو کو بالکل خارج کرنے کی نیت تھی مگر حکومت یو۔پی نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اب اکاڈمی ہندی اور اردو دونوں کی طرف پوری توجہ کرے گی۔ مگر دسمبر ۱۹۵۶ء کے ایک جلسے میں اس کے دستور میں جو ترمیم کی گئی ہے اس کی وجہ سے نہ صرف اکاڈمی کی پوری تاریخ حرف غلط ہو جاتی ہے بلکہ اردو زبان و ادب کے ساتھ بھی بڑی بے انصافی ہوئی ہے پرانے دستور میں یہ صراحت تھی کہ اکاڈمی کا مقصد ہندی اور اردو میں دوسری زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ اور ان کی اشاعت کا انتظام ہے۔ نیز ہندی اور اردو دونوں میں تصنیف و تالیف کی ہمت افزائی بھی اکاڈمی کے مقصد میں شامل ہے اب جو ترمیم ہوئی ہے اس کی رو سے اکاڈمی کا نام بدل کر اتر پردیش اکاڈمی کر دیا گیا ہے۔ یہ نام بھی بُرا نہیں، حالانکہ ایک ایسے ادارے کا نام بدلنا جو اتنے عرصے تک علمی دنیا میں متعارف رہا ہے اچھی بات نہیں، پھر بھی اتر پردیش اکاڈمی کے نام پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ مگر اکاڈمی کے بنیادی مقاصد میں حسب ذیل ترمیم پر ہمیں سخت اعتراض ہے۔

"سرکاری زبان ہندی اور دوسری اُن زبانوں
کی حفاظت، توسیع اور ترقی جو ہندی کے
ماتحت ہیں یا جن سے ہندی میں اضافے کا
امکان ہے۔"

اس میں اردو کے نام کو خارج کرنا اگر تنگ نظری نہیں تو اور کیا ہے۔ ہندی ضرور یو۔پی کی سرکاری زبان ہے اور اس کی توسیع و اشاعت کے لئے حکومت یا اکاڈمی جو بھی قدم اٹھائے وہ مبارک ہے۔ مگر یو۔پی میں ایک اور زبان اردو بھی رائج ہے جس کا ہندستان کے دستور میں ذکر ہے اور جو ہندستان کی چودہ قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ ہندی کی ماتحت زبان نہیں ہے۔ اس کا خود ایک مستقل وجود ہے۔ اردو کے نام سے اس قدر بیزاری اور ہندی کی ماتحت زبان کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کرنا حب الوطنی، قوم پرستی اور جمہور پرستی سب کے منافی ہے یہ ہماری مشترک تہذیب پر ایک ناروا حملہ ہے۔ ہم یو۔پی کی حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ یہ ترمیم منظور نہ کرے اگر پچھلے دستور میں ترمیم ضروری ہے تو وہ اس طرح ہونی چاہئے

"یو۔پی کی سرکاری زبان ہندی اور اردو
اور دوسری اُن زبانوں کی ترقی، توسیع اور
اشاعت جو صوبے میں رائج اور مقبول ہیں۔"

ہندی زبان کو بلند مقام دینے پر ہمیں اعتراض نہیں۔ یہ یو۔پی کی سرکاری زبان ہے۔ ہمیں اس بات پر اعتراض ہے کہ اردو کو جو اس صوبے کی ایک اہم زبان ہے کیوں نظر انداز کیا گیا ہے اور کیوں ماتحت زبانوں کا تذکرہ کر کے اردو کو ایک جزوی اور ذیلی حیثیت دی گئی ہے۔

حکومت یو۔پی کا فرض ہے کہ وہ صوبے کے سارے تہذیبی سرمائے کی حفاظت اور ترقی کے لئے تمام ضروری تدابیر اختیار کرے۔ ہمارا خیال تھا کہ اب تنگ نظری کے بادل چھٹ رہے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہندستانی اکیڈمی کے ممبران کی اکثریت ابھی تک اسی مرض کا شکار ہے۔ زبان سے انصاف کا نام لینا بیکار ہے جب تک عمل اس کی گواہی نہ دے۔

مرکزی تعلیمی بورڈ کی سفارشات

ابھی حال میں مرکزی تعلیمی بورڈ کا جو اجلاس ہوا ہے اس میں یہ سفارش کی گئی ہے کہ تمام ریاستی حکومتیں ثانوی تعلیم کے دوران میں تین زبانیں لازمی رکھیں یعنی مادری زبان یا علاقائی زبان، ہندی اور انگریزی تمام طالب علم لازمی طور پر پڑھیں جن

ریاستوں میں ہندی علاقائی زبان ہے وہاں کوئی اور جدید ہندستانی زبان پڑھیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس طرح بیشتر ریاستوں میں اردو کی تعلیم کا بھی لازمی طور پر انتظام ہو سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ریاستی حکومتیں کس طرح اس تجویز پر عمل کرتی ہیں۔

بورڈ نے اس امر پر بھی طمانیت کا اظہار کیا کہ حکومت نے ایک قومی بک ٹرسٹ قائم کر دیا ہے اور سفارش کی کہ چونکہ ملک میں متعدد زبانیں رائج ہیں۔ اس لئے ریاستی حکومتوں کو چاہئے کہ علاقائی زبانوں میں بھی بک ٹرسٹ قائم کئے جائیں۔ تاکہ ہر زبان میں اچھی کتابوں کی اشاعت کے قرار واقعی انتظامات ہو سکیں۔ چونکہ سوا کشمیر کے ابھی تک اردو کسی ریاست کی سرکاری زبان قرار نہیں دی گئی ہے اس لئے ہماری گزارش یہ ہے کہ مرکزی حکومت اردو کا ایک بک ٹرسٹ بھی قائم کرے جس میں اردو کے تمام معتبر اداروں کی نمائندگی ہو۔ انجمن ترقی اردو ہند اس سلسلے میں پورا تعاون کرے گی۔

اردو لغت

مولانا عبدالماجد دریابادی

اردو کی جامع لغت کی تجویز بڑی اہم، بڑی ضروری ہے۔ انجمن یہ کام کروا لے تو بڑے کی بہت کچھ کر ڈالا۔ مولوی عبدالحق صاحب کے مرتب کرائے ہوئے لغت کے کچھ اجزا میں نے پڑھے تھے۔ بڑی محنت بڑی تفتیش، بڑی تحقیق سے لکھے ہوئے تھے۔ احتشام الحق دہلوی، ایم۔ اے دھیگ (مرحوم اس کام کے لئے گویا خلق ہی ہوئے تھے۔ تحریک کا خیر مقدم صمیم قلب سے کرتا ہوں۔

دو باتیں اور اسی سے ملتی جلتی یہاں پیش کرتا ہوں۔

(۱) ایک اردو اور انگریزی لغت کی بھی شدید ضرورت ہے۔

(۲) عام انسائیکلو پیڈیا کی تیاری میں تو خیر بہت دشواریاں ہیں۔ نسبتاً ہلکا کام ادبی انسائیکلو پیڈیا کا "قاموس الادب" کے نام سے ہو سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی اور انھوں نے اسے بہت ہی پسند فرمایا تھا۔ افسوس ہے کہ قبل اس کے کہ عمل شروع ہو سکے اگست ۱۹۴۷ء والی مصیبت نازل ہو گئی۔ آپ کے تازہ پرچہ میں مضمون "رفتار" بھی بڑے کام کا ہے۔

جناب سید شہاب الدین دسنوی

"ہماری زبان" کی اشاعت مورخہ ۸ جنوری میں اردو لغت سے متعلق آپ کا اداریہ پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ اس مبارک تجویز کا تہہ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ آپ کے تفصیلی اعلان کا بڑی بے چینی سے منتظر رہوں گا۔

چھوٹی لغت کم سے کم پانچ ہزار کی تعداد میں چھپنی چاہئے تاکہ اس کی قیمت عوام اور بالخصوص طلبہ کے حد امکان میں ہو ورنہ مقصد فوت ہو جائے گا۔

یہاں کا ادارہ "انجمن اسلام" یا اس کا "ادبی پرنٹنگ پریس" اگر اس سلسلے میں کوئی خدمت کر سکتا ہے تو مطلع فرمایئے۔

جناب منظور الحسن صاحب لکچرار شعبہ اردو دار العلوم خلیلیہ ٹونک

۸ جنوری ۱۹۵۷ء کا اخبار "ہماری زبان" آج کی ڈاک سے ملا۔ آپ کی ادارت میں یہ جس تیزی سے ترقی کر رہا ہے وہ قابل تحسین و مبارکباد ہے۔ آپ نے اس کو ہفتہ وار بنانے کے ساتھ ساتھ اس کی صوری و معنوی دونوں حیثیتوں میں ※

※ میں بھی جاذبیت و کشش پیدا کر دی ہے۔

"رفتار" کے عنوان سے جو مستقل کالم خلیل الرحمٰن صاحب اعظمی نے شروع کیا ہے وہ بہت خوب ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور معلومات افزا ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ "ہماری زبان" اسی طرح ترقی کرے، پھولے پھلے اور پروان چڑھے۔ آمین۔

اسی اخبار میں یہ خوشخبری بھی نظر سے گزری کہ آں محترم "اردو کی ایک جامع لغت" کی تدوین کا ارادہ رکھتے ہیں اور مستند اہل زبان ادیبوں کی خدمات اس سلسلے میں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا اداریہ پڑھ کر بے ساختہ زبان سے نکلا۔

تری آواز مکے اور مدینے

اس دور میں جبکہ اردو زبان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ کوئی ایک ایسا جامع لغت مرتب کیا جائے۔ جو تمام نئے الفاظ و محاورات اور نئی اصطلاحات پر حاوی ہو۔

آپ کی یہ تجویز بہت ہی مناسب اور بر وقت ہونے کے ساتھ پسندیدہ بھی ہے ہم اس کا صدق دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور اپنی حقیر خدمات پیش کرتے ہوئے اس کی اشاعت کے لئے ہر ممکن کوشش کا پختہ وعدہ کرتے ہیں۔

خدا کرے آپ اس نیک ارادے کو جلد عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوں۔ امید ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں میں اس تجویز کو خوش آمدید کہا جائے گا۔

انجمن کی خبریں

نان پارہ یو۔پی

۳۰ دسمبر ۱۹۵۷ء کو انجمن ترقی اردو شاخ نان پارہ کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ ۳ بجے دن سے ڈاکٹر طاہر علی بیگ صدر انجمن کی صدارت میں موصوف کے مکان پر ہوا۔ جس میں مجلس عاملہ کے ممبروں کے علاوہ شہر کے ممتاز اشخاص نے شرکت کی۔ اور غور و فکر اور بحث و مباحثہ کے بعد امور ذیل طے پائے۔

(۱) پچھلی تجاویز کا جائزہ لیا گیا اور مرکز کی گشتی پر غور کیا گیا۔ "ہماری زبان" کی اشاعت کے لئے یہ طے پایا کہ فی الحال "ہماری زبان" کے ۵۰ پرچے منگوا کر شہر کے علم دوست اور اردو داں حضرات کی خدمت میں پیش کئے جائیں اور پھر ان سے خریدار بننے کی استدعا کی جائے۔ سکریٹری صاحب فوری کارروائی اس سلسلے میں کریں۔

(۲) پرائمری درجات میں اردو تعلیم کے لئے انجمن نے جو کوشش کیں ہیں ان پر اطمینان کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں یہاں کے نوجوانوں نے جس طرح سرپرستوں کے دستخط حاصل کرکے پرائمری درجات میں اردو تعلیم کے لئے آسانیاں پیدا کی ہیں ان پر مسرت کا اظہار کیا جاتا ہے خاص طور سے تسیم احمد صدیقی صاحب کی خدمات کو سراہا جاتا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ آئندہ بھی یہ طبقہ انجمن کے کاموں میں اس طرح تعاون کرتا رہے گا۔

(۳) ایک "اردو کانفرنس اور آل انڈیا مشاعرہ" کیا جانا طے پایا اور اس کے لئے ایک سب کمیٹی حسب ذیل حضرات پر مشتمل بنائی گئی ہے۔

(۱) ڈاکٹر طاہر علی بیگ (صدر) (۲) سید اختر حسین وکیل (۳) سید محمد اصغر رشیدی (۴) میر ابراہیم حسین (۵) نواب غضنفر علی خاں (۶) ایچ ظفور بخش اور (۷) راحت علی خاں (سکریٹری)

یہ سب کمیٹی کانفرنس اور مشاعرہ کا پروگرام اور بجٹ وغیرہ کا تخمینہ اور دیگر ضروری کارروائی عمل میں لائے گی اور بہت جلد اپنی رپورٹ کمیٹی میں پیش کرے گی۔ جلسہ کا سلسلہ تقریباً ۲ گھنٹے جاری رہا۔ آخر میں صدر صاحب نے حاضرین کی چائے سے ضیافت کی۔

(راحت علی خاں۔ آفس انچارج)

امروہہ یو۔پی

شاخ امروہہ کا اٹھارواں ماہانہ علمی ادبی اجتماع محلہ کنگوئی میں جناب مولوی دباج احمد خاں صاحب وکیل کے مکان پر انعقاد پذیر ہوا۔ گزشتہ اجتماع کی کارروائی مصدق ہوئی۔ نوجوان افسانہ نگار جناب جے پال صاحب نے اپنا افسانہ "ڈوبتے کنارے" پیش کیا۔ جمال صاحب نظامی نے ایک دوسرے افسانہ سے محظوظ فرمایا جس کا عنوان تھا "ان کا عشق" دونوں افسانے بہت پسند کئے گئے۔ جے پال صاحب کی ژرف نگہی اور انسانی زندگی کے عمیق مطالعہ کو خاص طور پر سراہا گیا۔ اس کے بعد جناب وقار احمد صاحب رضوی نے "زبان کا نفسیاتی اور اصولی تصور" کے عنوان سے ایک گراں قدر تحقیقی مقالہ پڑھا اور محنت و کاوش کی داد حاصل کی۔ آخر میں مشہور مزاح نگار حضرت شہباز لمعہ پرواز امروہوی نے اپنی ایک تازہ نظم لیڈر سے مسرور کیا۔ جملہ تخلیقات پر سنجیدہ و صحت مند تنقید کے ساتھ جس میں مفتی نسیم احمد صاحب فریدی، مولانا سید محمد عبادت کلیم، جناب تاباں نقوی اور بعض دوسرے حضرات نے نمایاں حصہ لیا۔ انجمن کا یہ اجتماع رات گئے حاضرین و میزبان محفل کے شکریے پر ختم ہوا۔ انجمن کی جانب سے تعلیم بالغاں کے شبینہ مدارس کی اسکیم میں تعاون کی اپیل بھی کی گئی۔ واضح رہے کہ امروہہ میں انجمن حیات اللہ انصاری کے طرز تعلیم کے مطابق کامیابی کے ساتھ تعلیم بالغاں کے دو اسکول چلا رہی ہے اور عنقریب مزید اسکول کھولنے کا انتظام کر رہا ہے۔

انجمن کی امروہہ شاخ نے سال گزشتہ کی طرح امسال پھر طلبہ کے تحریری و تقریری مقابلوں کا انتظام کیا ہے۔ تقریری مقابلہ (ڈبیٹ) جس کا موضوع ہے "یو۔ این۔ او۔ امن عالم قائم کرنے میں ناکام ہے"

انجمن کے سالانہ علمی، ادبی اجتماع کے موقعے پر فروری ۵۸ء میں ہوگا۔ انجمن کے اس اجتماع میں مرکزی انجمن کے جنرل سکریٹری

ضروری اطلاع

مدراس کے اور کلکتہ کے ایک اخبار میں قیصر ہمدردی صاحب کی سرگرمیوں سے متعلق کچھ اطلاعات شائع ہوئی ہیں۔ اس میں ان کے نام کے ساتھ اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند شائع کیا گیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ وہ انجمن کے صرف ایک کارکن ہیں اور صحت علالت کی درخواست پر ان کو چھ ماہ کی چھٹی دی گئی ہے۔ اس وقت انجمن کے تعلق سے وہ کسی کام کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔

(جنرل سکریٹری)

پروفیسر آل احمد صاحب سرور مقابلوں میں کامیاب ہونے والے طلبہ کو انعامات تقسیم فرمائیں گے۔

حضرت وحشی رام پوری، جناب وجے رام صاحب، سید سجاد ظہیر صاحب، حیات اللہ انصاری صاحب، بیگم سلطانہ حیات اور دیگر اکابر ادبا کی شرکت بھی متوقع ہے۔ تحریری مقابلوں کے مضامین ۱۵۔جنوری ۱۹۵۷ء تک تعلیمی اداروں کے ذمہ دار حضرات کی تصدیق کے ساتھ شاخ کے دفتر میں پہنچنے ضروری ہیں۔ مقابلوں کے عنوان حسب ذیل ہیں۔

۱۔ بی۔ اے گریڈ

(کالج، ادیب کامل، فاضل اور قابل سال دوم کے لئے)

"اردو شاعری اور وطنیت" فل اسکیپ سائز کے ۵۔ صفحے

۲۔ انٹرمیڈیٹ گریڈ

(عالم، ادیب ماہر) "پریم چند کی افسانہ نگاری" فل سکیپ سائز ۴۔ صفحے

۳۔ ہائی اسکول گریڈ (مولوی، منشی اور ادیب)

"میں کیا بنوں گا" فل اسکیپ سائز ۳۔ صفحے

۴۔ مڈل۔ (ابتدائی جامعہ اردو)

"میری زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ" فل اسکیپ سائز ۲ صفحے

۵۔ پرائمری درجات "ایک دلچسپ کہانی" " " " ۱ "

انجمن کی جانب سے ایک خصوصی انعام اس طالب علم کو ملے گا جو مختصر ترین افسانہ لکھے۔ اس مقابلے میں ہر جماعت کے طلبہ حصہ لے سکتے ہیں۔

بلند شہر یوپی

پروپیگنڈہ سکریٹری شاخ بلند شہر جناب نظر برنی تحریر فرماتے ہیں کہ ۱۳۔جنوری ۱۹۵۷ء کو انجمن کا ایک پندرہ روزہ اجلاس زیر صدارت جناب محمد خضر برنی صاحب صدر انجمن منعقد ہوا۔ پروپیگنڈہ سکریٹری نے جلسے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور انجمن کی سالانہ رپورٹ پڑھ کر سنائی۔

جلسہ میں کئی ریزولیوشن پاس ہوئے۔ جس میں اردو کو عام فہم بنانے کا ریزولیوشن قابل ذکر ہے۔

گوالیار کا شاندار مشاعرہ

جنوری کے پہلے ہفتے میں انجمن ترقی اردو ہند کی شاخ گوالیار کے اہتمام سے میلہ کمیٹی گراونڈ میں سالانہ مشاعرہ بڑے پیمانے پر منعقد کیا گیا۔ داخلہ ٹکٹ سے تھا۔ صدارت جناب راجہ بہادر گرگ سابق پریسیڈنٹ میونسپل کمیٹی نے فرمائی۔

مشاعرے میں ملک کے مقبول اور ممتاز شعرا حضرت جگر مرادآبادی، نشور واحدی، انور صابری، شفا گوالیاری، شمیم جے پوری، شہباز پرواز وغیرہ نے شرکت کی۔ مشاعرہ ۲ بجے رات کو نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ حضرت دعا اور کشب صاحب کی دل سوزی اور خلوص کی بدولت یہ کامیابی نصیب ہوئی۔ (سکریٹری)

غزل

ترے جمال سے عمر رواں کی برنائی
ترے خیال سے قلب و نظر کی گیرائی

یہ احتیاط محبت کہ روبرو تیرے
اٹھا سکا نہ نظر بھی ترا تمنائی

جہاں پہ راز محبت تو آشکار ہوا
انھیں سے کہہ نہ سکا حال ان کا شیدائی

غم فراق و غم آرزوئے یار سے ہے
وہ اضطراب کہ ہے جان صد شکیبائی

نہیں ہیں وہ نہ سہی دل میں انکی یاد تو ہے
اس ایک شمع سے روشن ہزار تنہائی

بہانے لاکھ دل حیلہ جو نے ڈھونڈ لئے
ترے بغیر مگر زندگی نہ راس آئی

امین خانماں ویراں کو پوچھتے کیا ہو
نہ جانے کون سے عالم میں ہے وہ سودائی

سید امین اشرف

جنتا لائبریری برہان پور

۱۳۔جنوری شب میں پونے ۹ بجے جنتا لائبریری ہال میں پندرہ روزہ ادبی نشست جناب عبدالرؤف شاہ صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں جناب گنگو پردیسی، چمن داس چمن، عزیز صاحب، اکبر اقبال، اکرام دول اور شفیق راز نے اپنی تخلیقات پڑھ کر سنائیں جن پر دوستانہ بحث ہوئی۔ اس کے بعد ایک مختصر سا مشاعرہ بھی ترتیب دیا گیا۔ جس میں جاوید انصاری جوائنٹ سکریٹری انجمن، ناشق صاحب، خورشید صاحب، حاتم صاحب، اقبال نجیب اور دیگر حضرات نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ (سکریٹری جنتا لائبریری)

اردو دنیا

وزیروں میں اردو

آندھرا کے وزیر داخلہ مسٹر گوپال ریڈی اور ایک دوسرے وزیر مسٹر وینکٹ ریڈی عوام سے رابطہ پیدا کرنے کے لئے اردو سیکھ رہے ہیں۔ یہ بات مسٹر نرسنگ راؤ وزیر آندھرا کی اردو فسٹول کی تقریر سے معلوم ہوئی۔

حضرت جگر کی حب الوطنی

ہندستان کے مایۂ ناز شاعر حضرت جگر نے آگرہ کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ پاکستان میں قیام کرنے کے لئے وہاں کے ذمہ دار حلقوں نے انھیں پیش کش کی تھی۔ مگر انھوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ ان کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ اپنے پیارے وطن ہندستان ہی میں رہیں گے بقول حالی

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

جوہر دکھانے کا وقت

مراد آباد کے ایک جلسے میں جناب جگ جیون لال سیٹھ ڈائرکٹر انڈین نیشنل انسٹی ٹیوٹ نے فرمایا کہ حامیان اردو کو سرکار یا دیگر لوگوں کی طرف سے اردو کو نظر انداز کرنے کی پالیسی سے گھبرانا نہ چاہئے بلکہ یہی وقت اردو کے نکھارنے اور جوہر دکھانے کا ہے۔ زبان کو زیادہ سے زیادہ عام فہم اور سہل بنانے کی کوشش جاری رکھنی چاہئے یہ جلسہ اردو شعراء کی ایک بزم کا تھا جو ڈاکٹر جگت پرکاش شرما کی صدارت میں منعقد ہوا۔

ہندی کی بجائے اردو

روزنامہ نئی دنیا دہلی کی ۱۰ جنوری کی اشاعت میں ریاست یوپی سے متعلق اطلاع ہے کہ کلکٹریٹ دفتروں کو تنظیم نو کے متعلق رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ہندی سائن بورڈوں میں عام طور پر وہی الفاظ استعمال کئے جائیں جو عرصے سے مستعمل ہیں۔ مثلاً محافظ خانہ۔ مال خانہ۔ خزانہ وغیرہ ان کی بجائے ہندی الفاظ ابھی لیکھ، گکشن کوش گھر وغیرہ کوئی نہیں سمجھتا۔

کمشنر تنظیم نو جناب کے اے داس نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ عام لفظ "ہسپتال" کی بجائے "چکتسالیہ" کے بورڈ سے لوگوں کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

کبیر کا اسٹیشن

گورکھپور سے مغرب کی طرف ۱۷ میل مہاتما کبیر کی جائے پیدائش پر مگہر نرواں اسٹیشن کی شاندار عمارت ڈیڑھ لاکھ کے صرفے سے بن کر تیار ہو گئی ہے۔ عمارت کی دیواروں پر انسانی اطوار سے متعلق کبیر کے دوہے ناگری رسم خط میں کندہ کرائے گئے ہیں۔

مسافروں کے ٹھہرنے اور دیگر سہولتوں کا اچھا انتظام کیا گیا ہے۔ بجلی بھی لگائی گئی ہے۔ اس اسٹیشن کا افتتاح حال ہی میں شمالی مشرقی ریلوے کے منیجر کی بیوی مسز لکشمی اروڑہ نے کیا۔ یہ عمارت امن و شانتی کا نشان معلوم ہوتی ہے۔

سادھو پھریں بزار میں مانگیں سب کی خیر
نہ کا ہو سے دوستی نہ کا ہو سے بیر

کمیونسٹ پارٹی اور اردو

ہندستان کی کمیونسٹ پارٹی نے اپنے انتخابی منشور میں کہا ہے کہ اردو زبان کو مناسب تحفظ دیا جائے اور اردو بولنے والوں کو اردو میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے قانونی تحفظات دئے جائیں۔

کتب خانہ سالار جنگ

اب سالار جنگ اسٹیٹ حیدر آباد کا کتب خانہ عوام کے لئے کھول دیا گیا ہے۔ اس کتب خانے میں مشرقی مخطوطات کا انمول خزانہ تہہ ہے۔ بعض پہلوؤں سے یہ کتب خانہ ملک کے گنے چنے کتب خانوں سے بھی ممتاز ہے۔ نوادر کے مجموعے کے اعتبار سے یہ خدا بخش لائبریری بانکی پور پٹنہ، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ اور کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد کا ہمسر ہے۔

تبادلہ کتب

ماہنامہ کتابی دنیا کراچی نے اپنے ایک اداری نوٹ میں کتابوں کے تبادلے کے لئے حکومت پاکستان کو ان لفظوں میں توجہ دلائی ہے۔

" حکومت سے درخواست ہے کہ وہ ہندستان اور پاکستان میں تبادلہ کتب کی اجازت دے۔ اس سلسلے میں وہ جو چاہے پابندیاں عائد کرسکتی ہے۔ یہ بدیہی ہے کہ اس طریقے سے تجارت کتب کو بہت فروغ ہوگا اور ناجائز طباعت کتب کا ایک حد تک سد باب ہو جائے گا۔

اردو صحافت اور لکھنؤ

(از مولانا عبدالماجد دریاآبادی)

بندہ پرور اپنے ہوش کی آنکھ جب کھلی تو یہاں کے اخباروں میں سب سے پہلا نام "اودھ اخبار" گھر بار کے کانوں کے راستے دماغ میں داخل ہوا۔ اپنے زمانہ کا واحد روزنامہ۔ مدتوں اس شہر میں اس کا نہ کوئی حریف رہا نہ حلیف۔ منشی نول کشور اردو کے ایک بڑے سرگرم کارکن گزرے ہیں۔ انھیں کے مطبع سے یہ نکلتا تھا۔ بعد کو اس کی ابتدائی جلدیں دیکھنے میں آئیں ۱۸۵۸ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ اور ہر طرح کا گرم و سرد سہتا ہوا پرانی پیچ سے گزرتا ہوا ابھی ۱۹۴۳ء میں تو بند ہوا ہے گویا عمر ۸۵ سال کی پائی۔ ہندو مسلم اتحاد کا پیکر تھا اور بغیر سیکولرازم کا ڈھنڈورا پیٹے ہوئے اس کا بہترین نمونہ۔ پائنیر سے ترجمہ کرکے خبریں اس وقت کے معیار سے تازہ بہ تازہ دیتا۔ اور کہیں سے پتا ہی نہ لگنے دیتا کہ اخبار ہندوؤں کا ہے یا مسلمانوں کا۔ بلکہ پھر اگر کچھ رنگ جھلکتا نظر آتا تو مسلمانوں ہی کے پلڑے کا۔ اتنی طویل زندگی میں ایڈیٹر صاحبان خدا معلوم کتنے آئے اور گئے چند کے نام آپ بھی سن لیجئے۔ سب سے پرانے منشی غلام محمد طپش یہ تھے تو دہلوی مگر ہو گئے تھے لکھنوی۔ انھیں ان کی آخری عمر میں میں نے دیکھا ہے۔ بڑی عسرت سے بسر کرتے تھے اپنے وقت کے منشی بے بدل تھے۔ ان کے بعد شرر صاحب۔ وہی شرر جنھوں نے آگے چل کر ناول نویسی اور ادب نوازی میں جھنڈے گاڑ دیئے اور پھر اپنے فسانۂ آزاد والے ظرافت نگار، سوکار، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور ان کے بعد منشی دوارکا پرشاد افق، منشی جوالا پرشاد، منشی نوبت رائے نظر، منشی ہر پرشاد سکسینہ، منشی کمٹ بہاری لال ماتھر، محمد حسن بریلوی، شوکت تھانوی اور سب سے آخر میں امین سلونوی۔ سیاسی پالیسی اس کی ہر دور میں صلح کل اور مرنجان مرنج رہی۔ اللہ نے بگڑنے کا فن اسے آیا ہی نہیں اور وہ جو ایک فارسی کا چلا ہوا شعر خواجہ حافظ کے کسی ہم تخلص کی جانب منسوب ہے کہ ؎

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام

با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام

تو یہ شعر و شاعری کے اعتبار سے جیسا بھی ہو، تھا اودھ اخبار کے مسلک کا ترجمان اور گویا اس کا ماٹو۔

مدت دراز کے بعد کہیں اکتوبر ۱۹۱۷ء میں جاکر لکھنؤ سے ایک اخبار "ہمدم" کے نام سے نکلا۔ جالب صاحب پیسہ اخبار لاہور کے علاوہ روزنامہ ہمدرد دہلی میں مولانا محمد علی کے ساتھ کام کئے ہوئے تھے اور شریفانہ صحافت کی ایک زندہ مثال تھے۔ تھے دہلی کے تھے مگر لکھنؤ پر ایسا لٹو ہوئے کہ یہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیا۔ یہاں تک ۱۹۳۰ء میں یہیں پیوند خاک ہوئے۔ ہمدم نے لکھنؤ بلکہ اودھ کی زندگی میں ایک نئی لہر دوڑا دی اور جب تک وہ جالب صاحب کے ہاتھ میں رہا بڑی آن بان سے نکلتا رہا چند سال بعد بعض ناخوشگوار حالات میں انھیں ہمدم چھوڑنا پڑا۔ اور پھر انھوں نے بڑی ہمت کرکے اپنا ذاتی روزنامہ "ہمت" کے نام سے نکالا۔ مگر چند ہی مہینہ بعد خود ان کا بلاوا عالم بالا سے آگیا۔ اسی زمانے میں عبداللہ خاں کسمنڈوی نے ایک روزنامہ "اخوت" کے نام سے نکلوایا جو کچھ ہی روز جاری رہ سکا۔ پہلی جنگ عظیم ابھی جاری تھی کہ ایک روزنامہ "سیارہ" بھی سید شبیر حسن تیتق کی ادارت میں چند روز خوب چمک دکھائی۔ ۱۹۱۹ء میں ایک پرچہ مولوی ظفر الملک کی ملکیت اور امین احمد عباسی شاگرد رشید سید جالب کی ادارت میں اور ایک گمنام شخصیت کی پس پردہ اعانت سے "حقیقت" نام سے نکلا کچھ روز ہفتہ وار رہا پھر عباسی صاحب کی تمام تر ملکیت و ادارت میں آکر روزانہ ہوگیا۔ اور آج تک بھی کسی طرح نکلا جاتا ہے۔ لکھنؤ بلکہ سارے صوبے میں نیشنلسٹ خیالات کا سب سے پرانا ترجمان ہے۔

ملک کی آزادی کے سال ڈیڑھ سال قبل مسلم لیگ کے افق سے چودھری خلیق الزماں کے روزنامہ "تنویر" نے اپنی شعاعیں پھیلائیں۔ روزنامہ "حق" عبدالروف عباسی کاکوروی کی ادارت میں اور "قومی آواز" حیات اللہ انصاری فرنگی محلی کی ایڈیٹری میں اس وقت بھی نکل رہا ہے اور جیسے بھی ہیں آپ کے سامنے ہیں۔ ہر تعارف و رونمائی سے بے نیاز۔ اور ہاں لیجئے! باتوں باتوں میں یہ

کہنا تو رہ ہی گیا کہ جناب مرحوم کی علیحدگی کے کچھ روز بعد ہمدم کی ملکیت بھی تبدیل ہو گئی کچھ دنوں عبداللہ خاں گستنڈوی کے ہاتھ میں رہا اور آخر میں اس کی باگ مولانا جمال میاں صاحب فرنگی محلی کے ہاتھ میں آئی۔ بند ہوئے ابھی چند ہی سال ہوئے ہیں۔

روزناموں کے میدان سے ہفتہ واروں کے چمن کی طرف سے گلگشت کرتے ہوئے آیئے تو سب سے پہلے تعارف مولوی محمد یعقوب صاحب فرنگی محلی اور ان کے ہفتہ وار "کارنامہ" سے ہوگا۔ کارنامہ لکھنؤ کا شاید قدیم ترین ہفتہ وار تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ اس سے بھی پہلے یہ "طلسم لکھنؤ" کے نام سے نکل چکا تھا۔ کارنامہ جاری ۱۹۰۸ء تک رہا لیکن شروع ۱۸۷۵ء سے ہوا تھا۔ لکھنؤ کی ٹکسال میں سکہ اس وقت فسانۂ عجائب والے سرور مبرور کے ادب و انشا کا چل رہا تھا۔ کارنامہ اسی بحر کا پورا شناور تھا۔ عبارت کا ایک چھوٹا سا نمونہ سن لیجئے۔ بغیر اس کے اس وقت کی طرز انشا کا خاکہ ذہن میں نہ آسکے گا۔ مولوی حکیم نور کریم صاحب دریاآبادی اس وقت لکھنؤ میں "طبیب گر" کے لقب سے مشہور تھے۔ وہ وطن مالوف چھوڑ بڑودہ کے دور دراز سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ کارنامہ اپنے ۲۰- فروری ۱۸۸۱ء میں ان کی روانگی کی منظر کشی کی تمہید یوں اٹھاتا ہے۔

"الحق انقلاب پسند فلک کج رو جو ہے اس حربا رنگ کی تدبیر تو ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہر علم کے فاضل جملہ فنون کے کامل اس شہر میں بکثرت نظر آتے تھے طلبہ تلمذ سے فیض اٹھاتے تھے۔ قدردانی امرا و روسا سے ہر شخص کو تحصیل کا شوق تھا۔ کسب کمال کا ذوق تھا۔ سرکار شاہی سے ایسی امداد کی جاتی تھی کہ اہل کمال کے احتیاج پاس نہ آتی تھی۔ جب سے ستارہ اختر نگر (یہ "اختر نگر" ڈھنگ سے سن لیجئے۔ واجد علی شاہ لکھنوی کا دوسرا نام تھا) زوال میں آیا مخالفت تقدیر نے نقش سلطنت مٹایا۔ کاملین پریشان ہوئے فکر معاش میں سرگرداں ہوئے تلاش احتیاج نے شرفا کو ایسا گھیرا کہ ہوش و حواس پراں ہوئے تعلیم اور تعلم کا مشغلہ گھٹا اس پر جو ذی علم و کمال ہزار طرح کی تکلیف سہہ کے خانہ نشین عزلت گزیں ہوئے وہ بھی کاوش پھیرے پھیرے اپنے ارادہ پر قائم نہ رہ سکے چار و ناچار جلاوطن ہوئے بہ تلاش قدرداں نکل گئے۔ چنانچہ جناب مولوی حکیم ..... وغیرہ وغیرہ۔

کارنامہ ہی کا ایک معاصر "مشیر قیصر" بھی گذرا ہے یہ ابھی منشی غلام محمد طپش کی ادارت میں نکلا تھا جن کا نام اودھ اخبار کی ایڈیٹری کے سلسلے میں آپ ابھی سن چکے ہیں ان کے معاً بعد نام منشی سجاد حسین کاکوروی کے اودھ پنچ کا آتا ہے۔ ظریفانہ مضمونوں اور کارٹونوں کے لحاظ سے لندن پنچ کی نقل تھا شہرت سے نام اب تک پڑھے لکھوں کی زبانوں پر ہے۔ ۱۸۷۷ء میں یعنی آب و تاب نکلا اور زندگی کے دن کسی طرح ۱۹۱۲ء تک پورے کرتا رہا۔ ایک دوسرا "اودھ پنچ" بھی اس کے بعد شیخ ممتاز حسین عثمانی کی ادارت میں نکلا اور کئی سال تک ظرافت کی پھلجھڑیوں سے لوگوں کا دل بہلاتا رہا۔ ریاض الاخبار اپنے وقت کے مشاہیر بے عدیل، ریاض خیرآبادی کے قلم کے سایہ میں تھا تو گورکھپور کا پرچہ لیکن آخر زمانہ میں کچھ روز کے لئے لکھنؤ بھی آگیا تھا اور یہ شعر اسی زمانے کا ہے ؎

ریاض تھی جو مقدر میں بازگشت شباب
جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے

دوسرے پرچوں کی تفصیل ایک ایک کہاں تک سنئے گا بس ایک مجمل سی فہرست پر قناعت کیجئے۔

(۱) پہلے نمبر پر "ہندستانی" پہلے ہفتہ وار تھا اور پھر سہ روزہ ہو گیا تھا۔ لکھنؤ کے مشہور لیڈر بابو گنگا پرشاد ورما کی ایڈیٹری میں نکلتا تھا۔ وہی جن کی یادگار گنگا پرشاد میموریل ہال اور لائبریری کی شکل میں آج بھی دیکھ رہے ہیں۔ ان کی وفات پر پنڈت کشن پرشاد کول نے اسے سنبھال لیا تھا اور چند سال زندہ رکھا تھا۔ نمبر(۲) پر "آزاد" احمد علی شوق قدوائی کی اور نمبر (۳) پر "تہذیب" جناب شرر کی ادارت میں اپنی بہار دکھاتے رہے نمبر(۴) ایک پرچہ "تفریح" کے نام سے نول کشور پریس سے غالباً منشی رام سہائے تمنا کی ایڈیٹری میں نکلتا رہا۔ نمبر (۵) اور (۶) سنی پرچوں میں "النجم" اور "آفتاب" قابل ذکر ہیں اور شیعہ پرچوں میں نمبر (۷، ۸) "سرفراز" اور "پیام اسلام" اور یہ دونوں اب بھی نکل رہے ہیں نمبر (۹) "اودھ پنچ" کے جواب اور شرر صاحب کی حمایت میں بہ سلسلہ مباحثہ گلزار نسیم ایک پرچہ "ظریف نامہ" بھی غالباً منشی نثار حسین کی ادارت میں کچھ روز

نکلا کیا اور نمبر (۱۰) "صبح" کے نام سے ایک پرچہ ظرافت کی روایتوں کو شاید اب بھی قائم رکھے ہوئے ہے اور ہاں نمبر (۱۱) اسی درمیان میں ایک بڑے مخصوص رنگ کا دینی اور تعمیری پرچہ "تعمیر" کے نام سے مولانا علی ندوی کی سرپرستی میں شائع ہوتا رہا۔

ہفتہ واروں کی سرحد عبور کر کے ماہناموں تک پہنچئے تو سب سے پہلے رنگ کے گلدستے یعنی مشاعروں کی تازہ غزلوں کے ماہانہ مجموعے دامن دل کو کھینچتے نظر آئیں گے اور ان میں شہرت کی کلغی ان دو کے سر پر نظر آئے گی۔ ایک "دامن گلچیں" زیرادارت رسیم خیرآبادی۔ دوسرا "پیام یار" زیرادارت منشی نثار حسین اور پھر ان کا آخری جانشین "معیار" زیر ادارت حکیم علی محسن آبر جو کچھ نثر کے مضامین بھی دیا کرتے تھا۔ ادبی رسالوں میں شہرت کا تاجدار خدنگ "نظر" تھا جو ایک صاحب نظر منشی نوبت رائے نظر کی ایڈیٹری میں نکلتا رہا۔ پھر مولوی ظفرالملک علوی کے "الناظر" کو جس نے زندگی شاید سب سے طویل پائی اور عبدالولی بی۔اے جیوائی تواری کے معلومات کو اور دصل بلگرامی کے مرقع کو کوئی کیسے بھلا دے اور علمی اور دینی رنگ میں ڈوبا ہوا پہلے مولانا شبلی کا اور ان کے بعد ان کے شاگردوں کا "الندوہ" جو آخر تک اپنے رنگ میں منفرد رہا اور جس کے ساتھ مولانا ابوالکلام۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی یادیں وابستہ ہیں۔ مرزا محمد ہادی رسوا کے "الحکم" کا دائرہ محدود رہا اور دوسرا شیعہ ماہنامہ "الواعظ" غالباً اب بھی نکل رہا ہے۔ خواجہ غلام الثقلین کے عصر جدید نے آج سے کوئی ۵۰ سال قبل کچھ روز خوب داد تحریر و تحقیق دی اور شرر صاحب کے تینوں رسالوں "دل گداز" اور "مورخ اول" "محشر" کا تو کہنا ہی کیا، شرر صاحب کا نام ہی کافی ہے۔ مذہبی رسالوں میں "صبح صادق" اور "الفرقان" اور ادبی رسالوں میں "نگار" اب بھی نکل رہے ہیں۔

چلئے تمیں ارشاد جوں توں ہوگئی اور ایک ہلکا اچٹتا سا خاکہ لکھنؤ کی اردو صحافت کا آپ کی سماعت میں آگیا، ابھی وقت میں چند سکنڈ باقی ہیں۔ ان میں بس اتنا اور سن لیجئے کہ ایک ہفتہ وار "سچ" کے نام سے ۱۹۲۵ء سے اور درمیانی وقفہ کے بعد صدق کے نام سے اب تک نکل رہا ہے۔ اصلاً مذہبی اور اصلاحی اور کچھ تھوڑا بہت ادبی۔ اس کے ایڈیٹر کا نام اگر آپ "ناگفتہ" ہی رہنے دیں تو اس میں آپ کا یا کسی کا کیا ہرج ہے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

مراسلات

مشاعرہ شعیب محمدیہ کالج

شعیب محمدیہ کالج آگرہ کی یونین کی جانب سے ۱۰ جنوری ۱۹۵۵ء کو سلطنت ہال میں ایک شاندار جشن مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرہ کی صدارت، جناب امیر احمد صاحب صدیقی پرنسپل شعیب کالج کی تحریک اور حضرت سیکش اکبرآبادی صدر انجمن ترقی اردو شاخ آگرہ کی تائید پر حضرت جگر مرادآبادی نے فرمائی۔ مشاعرہ سے پہلے کالج کی پی۔ ای۔ سی بٹالین نے حضرت جگر مرادآبادی کی خدمت میں گارڈ آف آنر پیش کیا۔ اس کے بعد فوٹو گروپ ہوا پھر یونین کی جانب سے حضرت جگر مرادآبادی کی خدمت میں ایک سپاسنامہ اور ایک پرس پیش کیا گیا۔ اس کے بعد یونین کے لارڈ پریسیڈنٹ بشارت علی خاں صاحب ارمان آفریدی نے حضرت جگر مرادآبادی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ ارمان صاحب کی تقریر کے بعد جناب پروفیسر مغیث الدین صاحب فریدی ایم۔اے علیگ، صدر شعبۂ فارسی و اردو سینٹ جانس کالج آگرہ نے حضرت جگر مرادآبادی کے تغزل کے ترکیبی عناصر پر ایک مختصر مگر جامع اور دلنشیں تقریر کی۔ پروفیسر فریدی صاحب نے بتایا:-

"حضرت جگر مرادآبادی نے اردو غزل کی پرانی علامتوں کو نئے تصورات دیئے اور غزل میں حسن کی لطیف کیفیات اور عشق کے سچے جذبات کی مصوری اس حسن کاری اور صداقت کے ساتھ کی ہے کہ اب اردو غزل کو یہ الزام نہیں دیا جا سکتا کہ اس میں سوائے گل و بلبل اور حسن و عشق کی خیالی تصویروں کے اور کچھ نہیں ہے۔ جگر کی غزل میں صرف عاشق کے جذبات محبت ہی نہیں ہیں بلکہ محبوب کا جذباتی رد عمل بھی ہے۔ جگر کی غزل میں اس قسم کے اشعار

آنکھوں میں نمی سی ہے چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

ادھر سے بھی ہے سوا کچھ ادھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی ان سے آہ بھی نہ ہوئی

یہ ثابت کرتے ہیں کہ جگر کی غزل عشق کی یک رخی تصویر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جگر نے حسن کا جو بلند اور پاکیزہ تصور پیش کیا ہے وہ اردو غزل میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔"—— پروفیسر فریدی کی تقریر کے بعد مشاعرہ شروع ہوا۔ مشاعرے میں حضرت جگر مرادآبادی کے علاوہ مقامی اور بیرونی شعراء کرام نے شرکت فرمائی۔

—— محمد نسیم خاں حسن جنرل سکریٹری شعیب کالج یونین

تبصرے

از ڈاکٹر مسعود حسین

نئے اور پرانے چراغ

پروفیسر آل احمد سرور

قیمت : پانچ روپے ، لکھائی چھپائی معمولی

ملنے کا پتہ : ادارہ فروغ اردو ، لکھنؤ۔

"نئے اور پرانے چراغ" پروفیسر آل احمد سرور کے ان تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۴۷ء تا ۱۹۴۹ء قلمبند کئے گئے۔ کتاب مذکور کا تیسرا اڈیشن مع اضافہ جدید حال میں شائع ہوا ہے۔

ہر چند اس مجموعہ میں سرسید ، رشید احمد صدیقی اور سجاد انصاری پر لکھے ہوئے مضامین بھی شامل ہیں ۔ لیکن مجموعی طور پر سرور صاحب اس کتاب کے ذریعے ناقد شعر کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ "نئے اور پرانے چراغ" ، اقبال اور اس کے نکتہ چیں ، اردو شاعری میں قافی کی تعدد قیمت ، جنگ عظیم کے بعد اردو شاعری وغیرہ ، یہ تمام مضامین شعر اور شعری تحریکات سے متعلق ہیں ۔ اور ایک ایسے زمانے کی یادگار ہیں ۔ جب جدید تنقید اور سرور صاحب دونوں کا تشکیلی دور تھا۔ جدید اردو تنقید اور سرور صاحب دونوں ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہوئے پچھلے دس سال میں زیادہ ٹھہراؤ اور صلابت والے تک پہنچ چکے ہیں۔ جس کے شاہد مصنف کے بعد کے تنقیدی مضامین ہیں جو "تنقید کیا ہے" اور "ادب اور نظریہ" میں یکجا کر دئے گئے ہیں۔

گزشتہ پندرہ بیس سال سے اردو تنقید "نظریہ پرستی" کا شکار رہی ہے ۔ اس تنقیدی مطلقیت کے ابتدائی دور میں بعض نہایت مضحکہ خیز تنقیدات ادب سے سابقہ پڑتا ہے ۔ سرور صاحب کے تنقیدی شعور کی ابتدا ایک ردعمل سے ہوتی ہے ۔ اس کی اچھی مثال اس مجموعے میں ان کی وہ آراء ہیں جو جوش اور اقبال کے سلسلے میں دی گئی ہیں جن کے توازن نے اردو تنقید کو بت پرستی اور بت شکنی دونوں کے چکر سے نکال لیا۔ یہی وجہ ہے کہ سرور صاحب کی نرم وگرم مرنجاں مرنج تنقیدات جو ہمیشہ توازن سے مزین اور اعتدال سے مہکتی رہیں۔ ترقی پسند تنقید کے ایک جتھہ گروہ کو متاثر نہ کرسکیں جو کلاسیکی ادب کا جائزہ صرف ایک نشتر زہر آگیں سے لینا چاہتا تھا ، جو چاہتا تھا کہ اردو تنقید ایک غیر ادبی مجرد تصور کے کھونٹے سے باندھ دی جائے ۔ یہ حقیقت میں ادب کے تاریخی تنوع اور اس کے تسلسل سے بے خبری تھی۔

سرور صاحب سے لوگوں کو کم نظر ہونے کا گلہ نہیں "بے نظریاتی" ہونے کی شکایت ہے ۔ وہ ترقی پسند تحریک کے ان رندوں میں سے ہیں ، جن کے نقطۂ نظر کی طرف یہ تحریک اپنے اعتدال کے زمانے میں برابر رجوع ہوتی رہی ہے ۔ خود سرور صاحب معترضین سے اس طرح متاثر ہوئے ہیں کہ اب وہ ادب میں نظریے کی اہمیت پر زور دینے لگے ہیں اور خود ایک نقطۂ نظر کی تلاش میں ہیں۔ بعض حال میں یہ احساس ہونے لگا ہے کہ ناقد جیوتی "مطلقیت" کی طرح جیوتی "اضافیت" کا بھی شکار ہوسکتا ہے ۔

"نئے اور پرانے چراغ" کے بیشتر مضامین ، تاریخی اہمیت کے باوصف سرور صاحب کی نمائندہ تحریریں نہیں کہلائے جاسکتے ان کی زبان تنقید کی سنجیدہ زبان نہیں ، وہ اردو کے سرمایۂ شعری کی ذخیرہ خیالی ہے ۔ اس کو ابھی تاریخی فلسفیانہ اور فنی ثقافت سے پختہ کرنے کی ضرورت ہے ۔ اس مجموعے کے اکثر مضامین مثلاً غالب کے پیچھے تاریخی اور فلسفیانہ پس منظر کی کمی کا احساس ہوتا ہے ۔ اکثر جگہ مصنف نری شعری تراکیب کے سہارے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ، ایسے مواقع پر اس کی تنقید گل کشائی کرنے کی بجائے خود زلف گرہ گیر بن جاتی ہے ۔

اس لحاظ سے سرور صاحب کے بعد کے مجموعے "نئے اور پرانے چراغ" سے یقیناً بہتر ہیں ، جن کے بعض مضامین تنقید جدید کی عزیز ترین متاع ہیں۔

لطائف السعادت

مرتبہ : ڈاکٹر آمنہ خاتون

قیمت : پانچ روپے

ملنے کا پتہ : نمبر ۲۴۳۱۹ فسٹ عیدگاہ ، میسور۔

رسالہ ہٰذا کے مولف ، اردو کے شگفتہ مزاج شاعر ، اور نباض زبان انشا اللہ خاں ہیں ۔ جنھوں نے اس مختصر رسالے میں نواب سعادت علی خاں کے پچپن لطیفوں کو یکجا کر دیا ہے ۔ انشا اپنی اس تالیف کو کارنامۂ حیات سمجھتے تھے اور نواب کے ہر فقرے اور بول کا قول اس انداز میں کرتے ہیں کہ گویا لب اعجاز کا کرشمہ ہو

حقیقت حال یہ ہے کہ ان لطیفوں سے درباری ظرافت کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ظرافت بھی وہ جو سستی پھبتیوں اور لفظی بندشوں پر مشتمل ہو۔ یہ محض انشا کی ستم ظریفی ہے کہ انھوں نے اپنا وقت اس پر صرف کیا اور ڈاکٹر آمنہ خاتون کے لئے یہ بار امانت چھوڑا کہ وہ اس تالیف کو اپنے حواشی اور نوٹ کے ساتھ مرتب کریں۔ انشا کی اس کاوش بے سود کا سودا اس وقت گراں نہیں گزرتا جب ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے اپنے حواشی کے ذریعے ان بے مغز لطیفوں کو پر مغز بنا دیا ہے۔ دراصل یہی حواشی اور نوٹ جن میں انشا کے بارے میں بڑی تحقیق اور کاوش سے مواد جمع کر دیا گیا ہے حاصل کتاب ہیں۔ لطائف السعادت کی ترتیب میں ایک تحقیقی سلیقہ اور سگھڑپن ملتا ہے جو ڈاکٹر آمنہ خاتون کا حصہ ہے اور تحقیق کو اس سگھڑاپے کی سخت ضرورت ہے۔

میخانۂ تغزل

مرتبہ سید شاہ عطاء الرحمن عطا کاکوی
قیمت دو روپے۔ کاغذ طباعت معمولی
ملنے کا پتہ:۔ ایوان اردو پٹنہ۔

اردو کے دس مایہ ناز غزل گو شعرا کی دس دس نمائندہ غزلوں کا انتخاب مع مختصر حالات اور تنقید۔ بظاہر درسی نقطۂ نظر سے یہ انتخاب کیا گیا ہے، لیکن حسب معمول طلبا کی ضرورت سے زیادہ مرتب نے اپنی پسند کو ملحوظ رکھا ہے۔ اردو کے شعری انتخابات بالخصوص غزلیات کے انتخاب کا یہ ایک عام نقص ہے اپنی پسند کے لحاظ سے انتخاب خاصہ ہے، شعراء کے حالات زندگی سرسری ہیں اور ابتدائی حصے میں اردو غزل گوئی کی تاریخ اور فن پر جو اظہار خیال کیا ہے وہ حد سے زیادہ سرسری!

بقیہ رفتار

اور سطح بلند ہے۔ لیکن یہ بھی کچھ کم دلچسپ بات نہیں کہ آل احمد سرور کی حیثیت ترقی پسندوں میں بحیثیت ایک نقاد کے ہمیشہ مشتبہ سی رہی ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے تو یہاں تک تعصب برتا ہے کہ "اردو ادب کی تاریخ" میں احتشام حسین، سردار جعفری اور وامق جونپوری وغیرہ کو جگہ دی ہے لیکن آل احمد سرور۔ جذبی۔ اختر انصاری۔ بیدی، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی وغیرہ کا کہیں نام بھی نہیں۔ اب اسے ڈاکٹر صاحب کی تنقیدی بصیرت کا ثبوت سمجھا جائے یا کچھ اور، بہرحال اس تنقیدی رویے کی وجہ سے اس تحریک میں ان لوگوں کا غلبہ ہوتا گیا جو "ترقی پسند" زیادہ تھے اور "ادیب کم"۔ لیکن زمانہ سب سے بے درد نقاد ہے۔ چند ہی سال گزرنے کے بعد کرشن چندر کے افسانے یا سردار جعفری، کیفی اعظمی، غلام ربانی تاباں اور وامق وغیرہ کی نظمیں بے جان نظر آنے لگیں۔ تو خود بخود ان کی ادبی ساکھ گرنے لگی جس کے نتیجے میں یہ سارے ادیب اپنا راستہ گم کر بیٹھے۔ کرشن چندر کی افسانہ نگاری اگرچہ اب بھی جاری ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ اب ایک تجارتی ادیب ہو کر رہ گئے ہیں۔ کیفی اعظمی پر مکمل سکوت طاری ہے۔ غلام ربانی تاباں اور وامق وغیرہ نے اب بین الاقوامی شاعری چھوڑ کر خالص غزل گوئی پر قناعت کر لی ہے

سجاد ظہیر کی کتاب ہمیں ترقی پسند مصنفین کے پرجوش کارکنوں سے تو ضرور آشنا کر دیتی ہے لیکن ان کی ادبی حیثیت اور ان کے فنی مرتبے کے سلسلے میں کوئی مدد نہیں کرتی۔ سردار جعفری کی ایک کتاب "ترقی پسند ادب" پر کئی سال ہوئے، انجمن ترقی اردو سے شائع ہوئی تھی لیکن ان کی دوسری تحریروں کی طرح یہ بھی اس غلط فہمی کا شکار ہو کر رہ گئی ہے کہ ادب میں محض ترقی پسندی ہی سب کچھ ہے، اس کے آگے اور کوئی مطالبہ نہیں۔

جب کسی ادبی تحریک کے نام لیوا ہمہ گیر نقطۂ نظر اور علم و فن کی بنیادوں کو چھوڑ کر چند افراد اور چند نعروں کے اسیر ہو جاتے ہیں تو ادب کی دیوی ان سے روٹھ جاتی ہے اس روٹھی ہوئی دیوی کو منانے کا نسخہ صحت مند اور صالح ادبی تنقید ہو سکتی ہے۔ سجاد ظہیر اور دوسرے اہل علم سے ہمیں توقع ہے کہ وہ پچھلے پچیس سال کے ادبی سرمائے کو تنقید کی کسوٹی پر رکھیں گے اسی صورت میں کھرے کھوٹے کا امتیاز ہوگا اور حقیقی معنوں میں ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ انصاف بھی۔

(پرنٹر پبلشر اطہر پرویز نے نیشنل پرنٹنگ کمپنی میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا۔)